قارئین عظام! کسی معتبر کتاب کی اشاعت و طباعت کے سلسلے میں حسن ترتیب، تصدیق اور صحت کلام کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ایک انسان کی طاقت اور استطاعت جس قدر کوشش کا تقاضہ کرتی ہے اس میں ہم نے کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔ پھر بھی فروگزاشت فطرت انسانی کا خاصہ ہے۔ اس لئے ہم نہایت ادب کے ساتھ اصحاب علم سے درخواست کرتے ہیں کہ ہماری کسی بھی خطا یا کوتاہی کی نشاندہی کرکے شعر و ادب اور اختر مسلمی مرحوم کے حق سے سبکدوش ہوں۔

ہم آخر میں قارئین کرام سے مرحوم کے حق میں بارگاہ ایزدی میں دست آوری کی درخواست کرتے ہیں کہ خداوند قدوس ان کی لحد پر لطف و رحمت کی بارش برسائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔

امید ہے کہ ہماری یہ گذارش صدابصحرا ثابت نہ ہوگی۔

ع شبانہ روز ہو تربت پر اس کی لطف ربانی

فہیم احمد

نئی دہلی

اختر مسلمی

فن اور شخصیت

ضیاء الدین صاحب اصلاحی، ڈائریکٹر دار المصنفین اعظم گڈھ

جناب اختر مسلمی مرحوم کے کلام کے دو مجموعے ''موج نسیم'' اور ''موج صبا'' ان کی زندگی میں چھپے تھے، اب ان کی وفات کے بعد دانش فراہی کی تگ و دو سے یہ کلیات شائع ہو رہا ہے۔

مرحوم کا اصلی نام عبید اللہ تھا، ان کا تعلق اعظم گڈھ کی مردم خیز سرزمین سے تھا، آبائی وطن اس ضلع کا مشہور گاؤں پھریہا تھا، جو ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کا بھی وطن تھا، لیکن اختر مرحوم کے والد بزرگوار نے اسی ضلع کے دوسرے ممتاز گاؤں ''مسلم پٹی'' میں سکونت اختیار کر لی تھی جہاں وہ درس و تدریس کی خدمت پر مامور تھے، اسی مردم خیز بستی کو مرزا احسان احمد جیسے ممتاز ادیب و شاعر اور بلند پایہ نقاد کے مولد ہونے کا فخر حاصل ہے، یہیں اختر صاحب بھی بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آخر یا تیسری دہائی کے شروع میں پیدا ہوئے۔ اور اسی کی نسبت سے وہ اپنے کو مسلمی لکھتے تھے۔

مرحوم کی ابتدائی تعلیم مسلم پٹی میں ہوئی، اس کے بعد انھوں نے اپنے علاقہ کی مشہور درس گاہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں داخلہ لیا اور اردو فارسی اور متوسطات تک عربی کی تعلیم حاصل کی، مگر والد کے انتقال اور خانگی پریشانیوں کی وجہ سے درمیان ہی میں تعلیم کا سلسلہ ترک کرنا پڑا اور گزر اوقات کے لیے پہلے معلّمی کا پیشہ اختیار کیا پھر صنعت وتجارت کو ذریعہ معاش بنایا اور سرائے میر میں متوطن ہوگئے اور اسی کی خاک کا پیوند بھی ہوئے۔

اعظم گڈھ میں اقبال احمد خاں سہیلؔ اور مرزا احسان احمد کے بعد کی شعرا کی نسل میں گوکئی اچھے شاعر پیدا ہوئے لیکن جناب اخترؔ مسلمی اس حیثیت سے ممتاز ہیں کہ انھوں نے جس دور میں شاعری کے کوچے میں قدم رکھا، یہ اردو کی ترقی پسند تحریک کے عروج وشباب کا زمانہ تھا، اس تحریک کے اثر سے اردو شاعری کی صنفِ غزل پر، جو اختر صاحب کو نہایت محبوب تھی بڑا سخت وقت آیا ہوا تھا چنانچہ جگر مرادآبادی جیسے غزل کے پرستار شاعر قحط بنگال سے متاثر ہوکر کہتے ہیں:

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل — شاعر نہیں ہے جو کہ غزل خواں ہے آج کل

اس کے بعد ''جدیدیت'' کا غلغلہ اِس زور شور سے بلند ہوا کہ غزل کے لیے ''نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن'' کا عالم تھا لیکن اس پُر آشوب دور میں جو شعرا غزل کو اردو شاعری کی آبرو سمجھ کر اس کے گیسو سنوارنے میں مصروف رہے ان میں جناب اخترؔ مسلمی بھی تھے، جو پورے عزم ووثوق سے کہتے ہیں:

حسن پر آنچ آنے نہ دیں گے — عشق کی شان جانے نہ دیں گے

خاک ہوجائے دل سوزِ غم سے — اشک آنکھوں میں آنے نہ دیں گے

اخترؔ مسلمی اصلاً غزل کے شاعر تھے اور اس کا ستھرا اور اچھا ذوق رکھتے تھے، غزل کا موضوع حسن وعشق کے معاملات اور الفت ومحبت کے جذبات کی ترجمانی ہے، عشق ومحبت کے نازک اور لطیف جذبہ کی ترجمانی ومصوری کے لیے پُر گو شاعر اور موزوں طبع ہونا کافی نہیں ہے بلکہ دردمند دل، بے چین طبیعت اور نکتہ شناس نظر والا ہونا بھی ضروری ہے، اس کے بغیر کوئی کلام لطافت ورنگینی کا پیکر، سوز وگداز کا مرقع، کیف وسرور اور لطف ونشاط کا سامان نہیں ہوسکتا، ایک غزل گو شاعر عشق کی صعوبتوں اور دشواریوں اور راہ محبت کے شدائد وآلام سے کبھی آزردہ اور مضطرب نہیں ہوتا، اس کو محبوب کی چشم قہر وعتاب میں لطف وعنایت اور اس کے جور وستم میں لذت وحلاوت ملتی ہے، وہ اس کی پیہم جفاؤں کا آرزومند رہتا ہے اور زخم کھا کر بھی مسکراتا ہے اور اپنی زبان پر کوئی حرف شکایت اور کلمہ فریاد نہیں لاتا، آہ وفغاں کو عشق کی توہین اور محبت کی رسوائی خیال کرتا ہے۔

تغزّل کی بزم کیف ونشاط میں آلام ومصائب کا گلہ، محرومیوں اور ناکامیوں کا دکھڑا اور ہمّت وولولہ شکن باتوں کا تذکرہ سراسر ناروا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں درد جاں نواز، غم روح پرور اور رنج وسرور لذّت بخش ہوتا ہے اور اسی لذّتِ غم سے قلب وروح کو بالیدگی اور فرحت وتازگی حاصل ہوتی ہے، عشق کے پاس ہر غم واندوہ کا مداوا، ہر درد کی دوا اور ہر مرض کا علاج موجود ہے، اس سودا میں نفع ہی نفع ہے اور کسی ضرر وزیاں کا کوئی اندیشہ ہی نہیں ہے۔ اخترؔ مسلمی مرحوم غزل کے ادا شناس اور اس کی خوبیوں اور نزاکتوں سے واقف، دولت درد سے مالامال اور عشق کے انعامات اور بخششوں سے پوری طرح متمتع تھے۔ اس لیے ان کا دل کیف ونشاط سے معمور اور

جوش و مستی سے سرشار رہتا تھا، نزولِ مصائب پر آہ و فریاد کے بجائے ان کے ہر بن مو سے صدائے مرحبا بلند ہوتی تھی، ان کے چند اشعار سے اس کی تصدیق ہوگی:

دردِ دل ، زخمِ جگر، سوزِ نہاں، اشکِ رواں   حضرت عشق نے بخشا ہے یہ انعام مجھے
خواہش کچھ اسی کو ہے ترے رحم و کرم کی   لذت نہ ملی ہو جسے بیداد و ستم کی
کیا کہوں دل مرا کس درجہ غنی ہے اے دوست   دولتِ درد اسے جب سے ملی ہے اے دوست
مجھ کو منظور نہیں عشق کو رسوا کرنا   ہے جگر چاک مگر لب پہ ہنسی ہے اے دوست
آپ کا تیر اور دل کو صدمہ   رنج ہوگا کسے میہماں سے
غمِ دوست اور میرا خانۂ دل   مکاں آباد ہے اپنے مکیں سے
چھپاتی رہیں رازِ غم زندگی بھر   مری آہیں نغموں کے سانچے میں ڈھل کے
نہ گلہ مصیبتوں کا نہ شکایتِ ستم ہے   ترے عشق نے سکھایا مجھے غم میں مسکرانا
رہے ذوقِ غم سلامت کہ اب آرزو ہے اختؔر   کوئی بجلیاں گرائے میں بناؤں آشیانا

اختؔر مسلمی کے لیے محبوب کا تصور و خیال ہی کافی روح پرور اور نشاط و طرب انگیز ہے، اس لیے ہجر میں بھی ان پر وجد کی کیفیت طاری رہتی تھی اور وہ فرقت اور جدائی کے عالم میں بھی مست و سرشار دکھائی دیتے تھے۔

یوں تصوّر میں تھا روئے تاباں ترا   شامِ غم میں بھی لطفِ سحر مل گیا

وہ ہمیشہ سرگرم جستجو رہنا پسند کرتے تھے، ان کے ذوق طلب ، شوق تمنا اور جوشِ آرزو کو کہیں قرار نہیں ملتا تھا۔ ان کا جذبۂ عمل منزل کو گریزاں بناتا تھا اور تلاشِ منزل کو کم طلبی اور عشق کی خامی سمجھتا تھا۔

کچھ نہ تھا منظور جز ذوقِ طلب   لوٹ آئے جا کے منزل کے قریب

راہِ طلب کی دشواریاں ان کا عزم و حوصلہ بڑھاتی تھیں، مشکلات ان کے گامِ شوق کو تیز تر کر دیتی تھیں، آسانیوں سے ان کا ذوقِ سفر لٹتا اور برباد ہوتا تھا، ان کی موج زندگی کو شورش عمل کے لیے ہمیشہ پرخطر راہوں کی تلاش رہتی تھی، ملاحظہ ہو:

یہ ہوائیں ٹھنڈی ٹھنڈی، یہ سکون بخش سائے   رہِ عشق کے مسافر تجھے نیند آ نہ جائے

ظاہر بینوں کو چاہے اس پر حیرت و تعجب ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ عشق فضائل و مکارم کا معلم و داعی ہے، اختؔر صاحب کو مکتبِ عشق سے غیرت و خودداری کا سبق ملا ہے، وہ گدایانہ عجز و ابتذال کو انسانی عظمت کے منافی اور آستان غیر پر ناصیہ فرسائی کو اپنی توہین سمجھتے تھے۔

میں اور کروں سجدۂ اغیار ارے توبہ   پیشانی فرشتوں نے مرے سامنے خم کی
آستانِ دوست کے سجدوں پہ ہے نازِ عروج   کب کسی کے سامنے جھکتی ہے پیشانی مری

وہ اپنی دنیا آپ تعمیر کرنے کے قائل تھے، دوسروں کا دست نگر بننے کے بجائے اپنے دست و بازو کی قوت پر ناز کرتے تھے اور اپنے درد کا درماں حاصل کرنے کے لیے کسی کا منت کش ہونا گوارا نہیں کرتے تھے، اپنا ظلمت کدہ اپنے جلوؤں اور اپنے جگر کے داغوں سے روشن کرنا چاہتے تھے:

ناگوار اس کو ہے شرمندۂ احساں ہونا   آگیا آپ مرے درد کو درماں ہونا
ہوجاتی ہے شامِ غم روشن اب میرے جگر کے داغوں سے
یہ انجم تاباں کیا ہوں گے، یہ ماہِ درخشاں کیا ہوگا

ان کی غیرت و خودداری نے ان کو حرص و آز سے بے نیاز کر دیا تھا، ارض و سما کی دولت بھی ان کو باطل کے سامنے سرنگوں نہیں کرسکتی تھی، وہ لالچ اور طمع کی وجہ سے اپنے

نظریہ ومقصد سے دست بردار نہیں ہو سکتے تھے، دولت وثروت کی فراوانی کے بجائے وہ اپنے فقر و افلاس پر مگن رہتے تھے۔

ملے اس کے عوض گر دولتِ کونین بھی مجھ کو   در باطل پہ ناممکن ہے میں سر خم کروں اپنا
منزل کی تمنا ہے تو ٹھکرا کے نکل جا   صیاد لیے دانہ و دام آتے رہیں گے
اخترِ مسلمی کے پاس ثروت و جاہ گر نہیں   وائے نصیبِ دشمناں گنجِ متاعِ فن تو ہے

ان کی طبیعت کی شرافت خویش و بیگانے میں فرق نہیں کرتی، دشمن کا درد و کرب بھی ان کو تڑپا دیتا ہے۔

تم ہو کہ ہے اپنوں پر بھی ستم، میں ہوں کہ ہے میرا یہ عالم
دشمن پہ بھی ہو بیداد اگر دل وقفِ الم ہو جاتا ہے

اختر مرحوم کی جرأتِ رندانہ کسی حیلہ و مصلحت کی پابند نہیں تھی، ان کی طبیعت منافقت اور ظاہر داری سے ابا کرتی تھی، وہ جھوٹ کو سچ اور حق کو باطل سے گڈ مڈ کرنا پسند نہیں کرتے تھے، موجودہ دور کے ''صلح کل'' کے علمبرداروں کے برخلاف وہ صیاد و باغباں دونوں سے دوستی کی پینگیں بڑھانے اور دیر و حرم دونوں کی عقیدت و محبت کا دم بھرنے کے قائل نہیں تھے، وہ ہماری گزشتہ تاریخ کو منافقت کے ان واقعات سے خالی بتاتے ہیں:

آباد رہیں دونوں بُت خانہ بھی کعبہ بھی   یہ بات نہ تھی تم میں اے شیخِ حرم پہلے

وہ ہر حال میں لوگوں کی خفگی اور ناراضگی کی پروا کیے بغیر حق و راستی کو اپنا شعار اور طغرائے امتیاز سمجھتے تھے، اور اس پر فخر کرتے تھے، ملاحظہ ہو:

ساری دنیا جو خفا ہے تو خفا رہنے دو   میرے ہونٹوں پہ مگر حق کی صدا رہنے دو
دوستو مجھ کو پرستارِ خدا رہنے دو   اہلِ بُت خانہ خفا ہیں تو خفا رہنے دو

میرے اظہارِ حقیقت پہ جہاں میں یارو   ایک ہنگامہ بپا ہے تو بپا رہنے دو
کر کے آمیزشِ باطل نہ کرو مسخ اسے   حق اگر حق ہے تو باطل سے جدا رہنے دو
ظلمتِ کفر میں گُم ہو گئے راہوں کے نقوش   دیدۂ شوق میں ایماں کی ضیا رہنے دو

اختر صاحب کے نزدیک غزل حدیث دلبری ہے لیکن ان کو اس کے صحیفۂ کائنات ہونے میں بھی کوئی تامل نہیں ہوتا تھا۔ انھوں نے اس کو جہاں حسن و عشق کی ترجمانی کا وسیلہ بنایا تھا وہیں کائنات اور اس کے مسائل کو بھی موضوعِ سخن بنایا تھا، گیسوئے دوست کی طرح گیسوئے قوم و وطن کو بھی سنوارنا ضروری خیال کرتے تھے۔
موجودہ دور کی بے راہ روی، تخریب کاری اور ابتر حالات نے شاعر کے حساس اور درد مند دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ درندگی اور بہیمیت کے شرم ناک مظاہرے، لوٹ کھسوٹ، ظلم و تشدد، بغض و نفرت، غریبوں اور کمزوروں کا استحصال، امراء و ارباب سیاست کی خود غرضی، رحم و مروّت اور اخلاق و شرافت کے پاکیزہ جذبات کا فقدان اور اخلاقی قدروں کی پامالی دیکھ کر شاعر کا دل درد و غم کی مجسم تصویر بن جاتا تھا اور وہ سینہ کوبی پر آمادہ ہو جاتا تھا لیکن اس کی ہمت کو آفریں ہے کہ وہ ایسے پر آشوب حالات میں بھی مایوس اور مضمحل نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کا امنگ و حوصلہ بلند رہتا تھا اور وہ تعمیر کا جوش و ولولہ رکھتا تھا، ایک مسلسل غزل کے اشعار سے موجودہ زبوں حالی اور شاعر کے ولولوں کا اندازہ ہو گا۔

ہر شبِ تارِ خزاں صبحِ بہاراں کر دیں   خارِ بے جاں کو بھی رشکِ چمنستاں کر دیں
عیش میں اپنے نہ ہو جن کو غریبوں کا خیال   ان کے ہر عیش کا شیرازہ پریشاں کر دیں
چیخ چیخ اٹھتے ہیں جس درد کی بے تابی سے   دلِ مظلوم کے اس درد کا درماں کر دیں

کر کے باطل کے خداؤں کی خدائی نابود　　دوستو آؤ علاجِ غمِ دوراں کردیں
چار سو بغض و عداوت کی گھٹا چھائی ہے　　دہر میں شمعِ محبت کو فروزاں کر دیں
ہے اخوت کا اثر جن کے دلوں سے مفقود　　ان درندہ صفت انسانوں کو انساں کردیں
ظلمتِ شب میں بھٹکتا ہے زمانہ اخترؔ　　آؤ ہر ذرّے کو خورشید درخشاں کردیں

ان شریفانہ جذبات اور پاکیزہ خیالات اور نیک احساسات کے بعد کس کو اختر صاحب کے اِس خیال میں شک ہوسکتا ہے کہ

اخترِ تباہ سے اِس قدر نہ چونکئے
حال ہی بُرا ہے صرف، آدمی بُرا نہیں

اختر مرحوم کا دل قوم وطن کے دامِ محبت میں گرفتار ہوکر ہمیشہ ان کا خیر خواہ اور ہمدرد رہا، ملک میں ہونے والی زیادتیوں، ناانصافیوں اور دہرے برتاؤ اور معیار کے خلاف انھوں نے بڑی ہمت و جرأت کے ساتھ آواز بلند کی، آزادی کے بعد فرقہ وارانہ ہنگاموں کی جو آگ بھڑکی اور جس میں انسانوں نے اپنے ہی ابنائے جنس کے خون سے ہولی کھیلی، جن لوگوں نے قومی تحریک اور آزادی کی جنگ میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا، ان کی خدمت کو نظر انداز کر کے ان کی وفاداری پر شک و شبہ کیا جانے لگا اور انھیں غدار قرار دینے کی کوشش کی جانے لگی، خودغرض، مکار اور مفاد پسند سیاست دانوں نے موقع پرستی اور اقتدار پسندی کا رویہ اپنالیا، یہ ساری باتیں اخترؔ کی شاعری میں فن کی خوبی و خوبصورتی کو برقرار رکھتے ہوئے تفصیل سے بیان ہوئی ہیں، ایک مسلسل غزل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

نہ شیخ کا ہے تذکرہ، نہ برہمن کی بات ہے
مری زباں پہ چند اہلِ مکر و فن کی بات ہے

کسی پہ گُل کی بارشیں، کسی کو خار و خس ملے
یہ باغ باں کا ظرف ہے، چمن چمن کی بات ہے
کسی کو خم کی خم ملی، کوئی ترس کے رہ گیا
ہٹاؤ جانے دو تمہاری انجمن کی بات ہے
جو بو الہوس ہیں، ان کو تم وفا پرست کہتے ہو
چلو یہی سہی، تمہارے حسنِ ظن کی بات ہے
وفا کرو جفا ملے، بھلا کرو برا ملے
ہے ریت دیش دیش کی، چلن چلن کی بات ہے

ان اشعار میں جو کرب اور طنز ہے ان کی کسک اور لذّت سے یقیناً ناظرین بھی بے چین اور لطف اندوز ہوئے ہوں گے۔ یہ اشعار سیاسی حقائق کا مرقع ہونے کے باوجود رعنائی و دلکشی سے معمور اور تغزل کے محاسن وخصوصیات سے پوری طرح آراستہ ہیں۔

اختر صاحب نے بادہ و ساغر کے پردے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو بھی کی ہے، فرماتے ہیں:

قصورِ نظر ہے کہ جانا نہ تجھ کو　　کہاں تیرے جلووں کو دیکھا نہ ہوگا

حمد و مناجات میں بھی اشعار کہے ہیں شروع میں وہ عشقِ مجازی کی وادیاں قطع کرتے رہے ہیں۔

بہر حال دل جلوہ گہہ ہے کسی کی　　جو کعبہ نہیں ہے تو بُت خانہ ہوگا

وہ اس سے واقف تھے کہ عشق مجازی عشق حقیقی کا زینہ اور بُت خانہ کی جلوہ

گاہ، کعبہ کی جلوہ گاہ تک رسائی کا وسیلہ بنتی ہے۔

ہے نورِ حقیقت کا جو یا تو مگر زاہد — اس راہ میں ملتے ہیں انوارِ صنم پہلے

مرے لیے تو سہل تر ہوگئی حق کی معرفت — زینۂ معرفت بنا عشقِ صنم کا سلسلہ

بالآخر وہ جلوہ گاہ حق پر پہنچ کے شاد کام ہوئے اور وہ اس طرح کے اشعار کہنے لگے

مصلحت کیا ہے مصائب میں مشیت جانے — بندگی کا تو تقاضا ہے کہ رحمت جانے

برس پڑیں گی گھٹائیں، امنڈ کے رحمت کی — تو سر جھکا کے ذرا اشک بار ہو تو سہی

ضیاء الدین اصلاحی
ڈائریکٹر دارالمصنفین اعظم گڈھ
۱۴؍جون ۲۰۰۲ء/۲ ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ

اختر مسلمی سے ایک ملاقات

سید حامد صاحب، سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اختر مسلمی کے مجموعۂ کلام پر تأثراتی تبصرہ کرنا میرے لیے خوشی اور فخر کا باعث ہے۔

ایک مرتبہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ پر حاضر ہوا تو وہاں کے اربابِ ذوق نے ایک شعری نشست کا پروگرام رکھا۔ جس میں میری پہلی ملاقات اختر مسلمی سے ہوئی اور انہیں کی زبانی ان کا لکھا ہوا اصلاحی ترانہ سنا تو اسی وقت مجھے ان کی عظمت کا اعتراف ہوگیا اور ان سے ان کی بہت سی غزلیں سننے کا اتفاق ہوا اور یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ اس چھوٹے سے قصبے میں اتنا عظیم شاعر موجود ہے۔

اردو شاعری کی مقبولیت کا اندازہ لگانا ہو تو بڑے شہروں کو چھوڑ کر قصبات میں جا کر دیکھیے، وہاں نا آلودہ ذوقِ شعر گوئی ملے گا اور غزل کی روایت کا تسلسل بھی۔ اردو شعراء کو دیکھنے اور سننے کے بعد میں اب اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہمارے ان شعراء کے یہاں بھی جو پرانی کلاسیکل روش پر چل رہے ہیں بہت کچھ پڑھنے، سمجھنے اور خط اندوز ہونے کے لیے ملے گا۔ شعر گوئی کا یہ کمال کیا کم ہے کہ وہ شاعر کو بھیڑ میں گم ہو جانے سے بچاتی ہے، اسے اس کی انفرادیت کا احساس دلاتی ہے۔ اس

کی شخصیت کو نشو و نما دیتی ہے ، اس کا دھیان اپنے جذبات و احساسات پر غور و فکر کرنے کی طرف دلاتی ہے، اُسے زبان کی صلاحیتوں سے آشنا کرتی ہے ،فکر اور اظہارِ فکر کی قدرت بخشتی ہے ۔ شاعر خواہ عرف عام میں اس کا مرتبہ کچھ ہی ہو، خود اپنا مرتبہ داں ہوتا ہے ۔ روزگار کے فشار، روز مرّہ کی بے کیف مصروفیات، افکار کی یورش اور حوادث کے سیلاب، نکتہ چینیوں کی یلغار، کدورتوں کے غبار اور کاروبار کی الجھنوں اور تعلقات کی پیچیدگیوں اور روح فرسا مکروہات ۔ ان سب کے لیے سپر بن جاتی ہے۔ وہ جذباتی اور فکری زندگی جو ہر چھوٹا بڑا شاعر اپنے لیے ڈھال لیتا ہے وہ اس کے لیے ایک حصار کا کام کرتی ہے جس میں وہ مگن اور مسرور رہ سکتا ہے ۔

اخترؔ مسلمی کی جو غزلیں طباعت کی منزل سے گذر چکی ہیں اور ہنوز جو محرومِ طباعت ہیں ان سے ان کی شخصیت اور اُن کے دِل کی تڑپ آشکار ہوتی ہے۔ محبوب کی ستم ظریفی کو کس سادگی سے داد دیتے ہوئے شاعر آگے بڑھتا ہے:

میں گلہ اگر کروں گا اسے ناروا کہو گے
جو ستم سے مر گیا تو مجھے بے وفا کہو گے
مرے دل کی اُلجھنوں کو مِری چشمِ نم سے پوچھو
میں زباں سے کچھ کہوں گا تو اسے گلہ کہو گے

ہمارے شاعر نے ناصح کی پذیرائی کس نرالے انداز سے کی ہے ۔

میں تو پوجتا ہوں ناصح کسی بُت کو بُت سمجھ کر!
تمھیں سابقہ پڑے گا تو اُسے خدا کہو گے!

☆☆

ہیں ترے دل کی طرح داغ مرے دامن پر
دل مگر صاف ہے ناصح ترے دامن کی طرح

شاعر نے بڑے اچھے انداز سے اپنے لیے نئی راہیں نکالی ہیں:

کیا کہوں کتنا ہے غم اپنے نشیمن کا مجھے
خود بکھر جاؤں نہ میں خاکِ نشیمن کی طرح

یہ مطلع باوجود اظہارِ حقیقت کے چونکا دیتا ہے :

کون رہتا ہے مکانوں میں مکینوں کی طرح
آدمی شہر میں چلتے ہیں مشینوں کی طرح

درد کی ٹیس اُٹھتی ہوئی دیکھئے:

کیا کروں یاد کو تیری کہ شبِ فرقت میں
وجہ تسکین بھی ہے باعثِ آزار بھی ہے

غزل کا شاعر حقیقت کو مسخر کیے بغیر نہیں رہتا:

جل گیا اپنا نشیمن مگر افسوس یہ ہے
پھونکنے والوں میں اک برقِ چمن زاد بھی ہے

چند اشعار اور نقل کر کے اس گفتگو کو یہاں تک پہنچاتا ہوں:

بجلیاں ہیں یہ سب خانہ زادِ چمن باغباں نے بنائے ہیں دار و رسن
کیا کروں شکوۂ جورِ چرخِ کہن! جب زمیں ہوگئی آسماں کی طرح

چند لمحوں کی مسرت پہ نہ اترا اے دوست
وقت ہے وقت یہ میرا ہے نہ تیرا ہوگا

دیکھنے والے مری خندہ لبی یہ بھی تو دیکھ
زخم رِستے ہیں مرے سینے کے اندر کتنے

کوئی شے یوں تو دھڑکتی ہے ہر اک سینے میں
دیکھنا یہ ہے کہ دل کتنے ہیں پتھر کتنے

☆

دل میرا داغوں سے بھرا ہے ان کا دامن پھولوں سے
فیضِ بہاراں اللہ اللہ عنواں ایک افسانے دو

سید حامد

۱۲/ستمبر ۱۹۹۶ء

جشن اختر مسلمی اور میرے دلی تاثرات

رئیس الشاکری صاحب

آ ہی گئے ہو شہرِ سخن میں جو دوستو!
ملتے چلو جو اخترِ رنگیں نوا ملے

چوڑے ماتھے پر معبودِ حقیقی کی بارگاہ میں سجدہ گذاریوں کا بیّن ثبوت، چمکتے فریم کی عینک کے صاف وشفاف شیشوں سے جھانکتی ہوئی ذہین آنکھیں، تبسّم ریز لب، گھنی اور سفید ریش دراز، بارعب لیکن شفقتوں کی علامات سے بھرپور چہرہ، علمی وقار اور سنجیدگی لیے ہوئے چال ڈھال، سرائے میر میں جہاں کہیں بھی نظر آئے، پہچان جائیے! یہی ہیں وہ جنھیں اختر مسلمی کے دلکش اور خوبصورت نام سے اہلِ شہرِ سخن برسہا برس سے جانتے پہچانتے ہیں۔

اختر مسلمی اور سرائے میر اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ہیں جیسے اعظم گڈھ کے ساتھ دارالمصنفین اور دارالمصنفین کے عظیم پیکر میں بلند قامت شبلیؒ اور بلند اقبال وسلیمانؒ، کہ ایک دوسرے کے بغیر کسی کا بھی تصور ممکن نہیں۔ سرائے میر کا نام لیجیے اور اختر مسلمی یاد نہ آئیں کیسے ہوسکتا ہے، سرائے میر کی ادبی تاریخ جب بھی مرتب

ہوگی اقبال سہیلؒ کے اس چہیتے شاگرد یعنی اقلیمِ تغزل کے شاہزادے اختر مسلمی کو نظر انداز نہ کر سکے گی، قمر اعظمی سچ کہتے ہیں:

"تیس سال سے برابر ہندوستان بالخصوص مشرقی یوپی اعظم گڈھ کے
مشاعروں کی جان دلوں کی دھڑکن اختر مسلمی کو کون بھول سکتا ہے"

اختر مسلمی سے اختلاف ممکن ہے لیکن اختر مسلمی کی مذکورہ عظمت سے انکار ممکن نہیں۔ اختر آپ کو پسند ہیں یا نہیں یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے اس ذاتی معاملہ میں کوئی دخیل نہیں ہوسکتا البتہ اگر اختر کی شاعرانہ صلاحیت اور بالغ نظری کا انکار ہو تو بے جھجھک عرض کروں گا...حضور! یہ سراسر زیادتی ہے، ایسی زیادتی جو اوروں کے لیے کم خود اردو شعر و ادب کے لیے زیادہ نقصان دہ اور تکلیف کا باعث ہے۔ اختر ایسی فضا میں حق دار ہیں کہ آواز دیں:

اختر مری نواؤں کو سمجھا نہیں کوئی!
ہر چند اہلِ بزم مرے ہم زباں رہے

تقریباً پندرہ سولہ سال پہلے کی بات ہے، راقم الحروف ایک مشاعرے کے سلسلے میں حاضر ہوا تھا، اسی مشاعرہ میں پہلی بار حضرت اختر مسلمی سے شرفِ نیاز حاصل ہوا اور حضرت اختر مسلمی کے فکر و فن کے ساتھ ان کے مسحور کُن ترنم نے دل پر گہرا اثر چھوڑا، ایسا اثر جس کی لذّت میں افاقہ کے بجائے اب تک اضافہ ہی ہوتا رہا، اور ہر ملاقات نئے پہلو اجاگر کرتی رہی، آخرش جشن اختر مسلمی کے سعید موقع پر ایمان لانا ہی پڑا:

اخترِ مسلمی کا نرالا ہے فن — ہے جداگانہ اندازِ شعر و سخن

اس کی باتیں حقیقت سے معمور ہیں — طرزِ گفتار ہے داستاں کی طرح

اختر مسلمی صاحب طرز شاعر ہیں۔ بنانے والے نے اختر مسلمی کو صرف شعر و ادب کی خدمت کے لیے بنایا ہے ساتھ ہی یہ کمال بھی عنایت فرمایا کہ افراط اور تفریط کی سنگلاخ وادیوں کی ہواؤں سے بھی دور کا واسطہ نہیں۔

غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا خوبصورت امتزاج اختر مسلمی کا خوش رنگ امتیاز ہے۔ عصری آگہی ان کے کلام میں بھرپور نہیں تو مفقود بھی نہیں۔

سماج پر ان کی تنقید، معاشرت پر ان کا تبصرہ، حالات حاضرہ پر ان کی گفتگو دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دینے کے مُترادف ہیں۔ لفظوں کی ساخت اور نشست و برخاست پر بھرپور نگاہ ان کی خصوصیت ہے۔ شاید یہ اُس مقدس اصلاحی تعلیم کا اثر ہو جو مدرسۃ الاصلاح کے متبرک ہاتھوں ان کے حصّہ میں آئی۔

لطف ہی کیا حیات کا گر نہ ہو غم کا سلسلہ — ختم نہ ہو خدا کرے رنج و الم کا سلسلہ
ہائے اس رہرو برباد کی منزل اے دوست — جس نے گھبرا کے ترا نقش قدم چھوڑ دیا
ہیں ترے دل کی طرح داغ مرے دامن پر — دل مگر صاف ہے، ناصح ترے دامن کی طرح

☆

رنگِ جدید روئے غزل سے عیاں رہے
لیکن غزل کی روح غزل میں نہاں رہے

خلوص دل کا پتہ پاؤ گے نہ چہرے سے — خراب پھل بھی تو اچھا دکھائی دیتا ہے
کیا خبر تھی سنگ دل نکلو گے تم — ہم تو اس صورت سے دھوکا کھا گئے

ان اشعار پر نگاہ کیجیے، فکروفن، زبان بیاں، وقت نگاہ، بلاغتِ نظر، تغزّل، نغمگی، سلاست اور برجستگی ہر اعتبار سے ہمارے خیالات مستند ہو جاتے ہیں۔

حسن تکلّم کے گداز ترنم کی فیّاضانہ دولت، نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اخترؔ ان خوش نصیب شاعروں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں جنھیں قدرت نے تکلّم کی بلندیوں کے ساتھ ساتھ حسن ترنم کی دولت سے بھی مالا مال فرمایا ہے، مختصر یہ کہ اخترؔ مسلمی اردو ادب میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں ان کے لب و لہجہ کی انفرادیت نے ان کی شخصیت کو ایسے رنگ و روغن عطا کئے ہیں کہ وہ دور سے پہچان لیے جاتے ہیں۔

خدانخواستہ میں یہ ہرگز نہیں کہنا چاہتا کہ اخترؔ مسلمی کی ذات اور ان کا کلام بے عیب ہے۔ بے عیب ذات خدا کی، بے عیب کلام خدا کا، اخترؔ بشر ہیں اور بشر، بشیرت کے تقاضوں سے بے اعتناء ہوجائے یہ ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی مگر مچھ سے بیر بھی رکھے اور دریا کی سیر کا شوق بھی کرے۔ اگر آپ چاہیں تو اور مؤدب لفظوں میں عرض کروں کہ دریامیں اترنے کے بعد دامن نہ بھیگے کیسے ممکن ہے،

زندگی کیا ہے گناہ آدم　　آدمی ہوں تو گنہ گار ہوں میں

مقصود کلام یہ ہرگز نہیں کہ اخترؔ مسلمی کی ذات بے عیب اور ان کا کلام نقص سے بالاتر ہے بلکہ میں کہنا چاہتا ہوں کہ اخترؔ اور ان کے کلام میں کوتاہیوں اور خامیوں کے گرد وپیش خوبیوں کی وہ گھنی باڑھ ہے کہ ہر کوتاہی اور خامی چھپ کے رہ جاتی ہے۔ انسان کے عظیم ہونے کے لیے یہ بہت ہے کہ اس کی کوتاہیاں

اس کی خوبیوں میں اس طرح چھپ جائیں کہ باریک بیں نگاہوں کو بھی دیکھنے میں دقّت محسوس ہو۔

ویسے عیب ڈھونڈھنے والوں کے لیے عیب بینی کی گنجائش کوئی حیرت کی بات بھی نہیں، حالاں کہ صداقت یہی ہے:

عیب سے پاک بشر ہو تو بشر ہی کیا ہے　　خوب کہتے ہیں جو اخترؔ کو برا کہتے ہیں

مبارکباد کے قابل ہیں سرائے میر کے وہ لوگ جنھوں نے جشن اخترؔ مسلمی کے پروگرام کو ترتیب دے کر اخترؔ مسلمی کی عزت نہیں بڑھائی بلکہ اپنی اختر شناسی سے بڑی حد تک وہ حق ادا کر دیا جو سرائے میر والوں پر قرض تھا، اخترؔ کی دور رس نگاہوں نے بہت پہلے اس جانب ایک بلیغ اشارہ کیا ہے:

روشنی پھیلے گی سمٹے گا اندھیرا اخترؔ　　مت بجھاؤ یہ امیدوں کا دیا رہنے دو

یہی وہ احساس ہے جس نے اخترؔ مسلمی کے اعتماد کو چار چاند لگادئے اور ان کی شاعرانہ عظمت اور مشفقانہ فکر وبصیرت زبانِ قلم کے سہارے بول اٹھی:

مجھ کو اک ٹوٹا ہوا شیشہ سمجھنے والو　　اسی ٹوٹے ہوئے شیشے کی صدا ہو تم لوگ

اخترؔ مسلمی بحیثیت شاعر اپنے فکر وفن پر کتنے عظیم ہیں اس کی وضاحت اور سند اربابِ فکر وفن سے طلب کیجیے، میں تو اس سعید موقع پر بڑی عقیدت کے ساتھ یہ کہنا چاہوں گا کہ اخترؔ مسلمی شاعر ہی نہیں بلکہ بہ حیثیت انسان بھی ایک عظیم شخصیت رکھتے ہیں اور ان کے سینے میں اک ایسا دل ہے جسے دیکھ کر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے:

سارے جہاں کا درد انھیں کے جگر میں ہے

دو سطروں کی یہ تحریر اخترؔ صاحب کے اس مقطع پر ختم کرتے ہوئے اجازت چاہوں گا:

اخترؔ ہے کس کی چشم عنایت سے فیض یاب
اک رند بادہ نوش بھی ہے پارسا بھی ہے

رئیس الشاکری الندوی

۹؍جون ۱۹۸۲ء

ماخوذ موج صبا

اخترؔ مسلمی صاحب کا فن
اور اُن کی شخصیت

ڈاکٹر ناطقؔ اعظمی صاحب، سرائے میر، اعظم گڈھ

اخترؔ مسلمی صاحب کس سنہ میں، کہاں اور کب پیدا ہوئے، انھوں نے کہاں تعلیم حاصل کی، ان کا مبلغ علم کیا ہے؟ ان کے پاس تعلیمی سلسلے کی کتنی ڈگریاں ہیں، ان سب کا پتہ لگانا ان کے سوانح نگار کا کام ہے، مجھے تو صرف ان کے فن اور شخصیت پر اپنے تاثرات کا اظہار کرنا ہے۔

فن اور شخصیت میں باہم اتنا گہرا ربط ہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی فن کو شخصیت سے اور شخصیت کو فن سے جدا نہیں کیا جا سکتا، جس طرح روح پیکر کے بغیر اپنی توانائی کا مظاہرہ نہیں کر سکتی اسی طرح فن بھی شخصیت کا مرہون منت ہے۔ بغیر فن کے نہ تو شخصیت نمایاں ہوتی ہے اور نہ بغیر شخصیت فن ہی اپنی جلوہ نمائی کر سکتا ہے۔ البتہ شخصیت جتنی عظیم ہوگی فن بھی اتنا ہی عظیم ہوگا۔

تصنیف و تالیف کی تاریخ جتنی قدیم ہے اس سے کچھ ہی کم تعارف و تبصرہ

کی بھی تاریخ ہے۔ اس سلسلہ میں عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ کسی تصنیف پر تعارف وتبصرہ کے لیے مصنف اپنے دور کے مستند اہلِ قلم اور مشہور اہلِ نگارش کی طرف رجوع کر کے ان کی دقیع رائے حاصل کرتا ہے، تا کہ اس کی تصنیف کی وقعت میں اضافہ ہو اور قارئین ایک وزن محسوس کریں، مگر اختر صاحب مجھے اس باب میں منفرد نظر آتے ہیں، انھوں نے اپنے مجموعۂ کلام پر تبصرہ کے لیے کسی بڑے آدمی یا عظیم شخصیت کی تلاش و جستجو نہیں کی بلکہ مجھ جیسے بے نام ونشان اور گم نام شخص کو اس خواہش کی تکمیل کا موقع دیا کہ میں بھی ان پر کچھ لکھنے کی سعادت حاصل کروں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اخترؔ صاحب کو اپنے فن اور اپنی شخصیت پر بے پناہ اعتماد ہے، وہ ایک لنگڑے آدمی کی طرح بیساکھی کا سہارا لے کر نہیں چلنا چاہتے کہ اگر بیساکھی کو الگ کر دیا جائے تو مجبورِ محض ہو کر رہ جائیں، ان کے اس عمل سے ان کی بھر پور انفرادیت ابھر کر سامنے آتی ہے، جو ان کی طبیعت کے استغنا کی غمازی کرتی ہے۔

اخترؔ صاحب نے کبھی شہرت کی فصیلوں پر کمند ڈالنے کی کوشش نہیں کی بلکہ شہرت کی فصیلیں خود آ کر ان کے قدموں میں گری ہیں، مگر انھوں نے اس سے بھی گریز کیا ہے، حالاں کہ بارہا ایسے مواقع ان کے ہاتھ لگے ہیں، اگر وہ چاہتے تو شہرت اور دولت دونوں حاصل کر سکتے تھے۔ صرف شہرت کے لیے انھوں نے اپنے ضمیر کا سودا کر کے نہ تو کسی کا حاشیہ بردار بننا پسند کیا اور نہ خود داری کو قربان کر کے کسی گروہ یا مدرسۂ فکر کے ہمنوا بنے، بلکہ اپنی شرافتِ نفس کی قندیلیں روشن کئے ہوئے مایوسیوں، محرومیوں، حق تلفیوں کی راہوں میں کبھی مسکرا کر حالات پر طنز کرتے ہوئے

کبھی آنکھیں نم کر کے گداز دل کا ثبوت دیتے ہوئے ہمت و استقلال کا پرچم لہراتے ہوئے گزرتے رہے۔ یہ بات مشہور ہے کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے، یہ بات تشنگانِ شہرت پر بھی منطبق ہوتی ہے کہ وہ حصولِ شہرت کے لیے سب کچھ گوارا کر لیتے ہیں جو ایک عام انسان کو بھی نہیں زیب دیتا۔ خدا کا شکر ہے کہ اخترؔ صاحب کا دامنِ صد چاک اس قسم کی آلودگیوں سے ہمیشہ پاک رہا۔

اگر آپ کو کبھی اخترؔ صاحب کے ساتھ چلنے کا اتفاق ہوگا اور آپ ایمان کے قائل ہوں گے، تو یہ محسوس کیے بغیر نہ رہیں گے، کہ

ع: مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

غزل گوئی اگر واقعی پارسائی کی ضد نہیں ہے تو بلاشبہ اخترؔ صاحب پارسا ہیں۔ صورتاً بھی اور سیرتاً بھی چمکتی ہوئی سفید ریش دراز، پیشانی پر سجدوں کا نشان، کوچۂ رقیب میں سر کے بل چلنے کی وجہ سے نہیں بلکہ معبودِ حقیقی کی بارگاہ میں پنج وقتہ جبیں رسائی کی علامت ہے، انھیں جب کبھی بھی آپ دیکھیں گے تو ان کے چہرے کی کیفیت سے بھی محسوس ہوگا کہ کوئی زاہد شب زندہ دار حصارِ خانقاہ سے نکل کر ابھی ابھی چلا آ رہا ہے۔ ان کے سراپا ان کی رفتار و گفتار سے یہ گمان بھی نہ ہوگا کہ یہ تقدس مآب شخص گیسوئے غزل کے شانہ کشوں میں بھی ہے۔

غزل اپنی ہیئت ریزہ خیالی کی وجہ سے بہت ہی آسان صنفِ سخن ہے مبدأ فیض نے جسے ذرا سی بھی موزونیِ طبع عطا کی ہے وہ آسانی سے چند شعر موزوں کر کے غزل تیار کر سکتا ہے۔ ہر قافیہ اپنے جلو میں مضامین کا ایک سیلِ رواں لیے ہوتا ہے، سامنے کے ہر سطحی مضمون کو شعر کے قالب میں ڈھال دینا کوئی مشکل نہیں ہے، مگر اپنے

شعور و ادارک سے کسی خیال کو ردیف و قافیہ کا پابند کیے بغیر شعر کے قالب میں ڈھالنا بحر بیکراں کو کوزے میں بند کرنے سے کم نہیں ہے۔ یہی وہ جادہ ہے جہاں نا تجربہ کار غبار راہ بن کر رہ جاتا ہے۔

اخترؔ صاحب نے گیسوئے غزل کی شانہ کشی میں ایک عمر گذاری ہے ۔ وہ صرف حریم غزل کے رازدار ہی نہیں بلکہ دوشیزۂ غزل کے ناز بردار اور اس کی عصمت کے بھی محافظ ہیں۔ غزل کی خود اپنی ایک زبان ہے، ایک مخصوص طرزِ ادا ہے، یہ وہ زبان ہے جس میں ''حسن وعشق'' باہم محوگفتگو ہوتے ہیں۔ مزاج حسن کتنا نازک اور مزاج عشق کتنا حساس ہوتا ہے؟ اس کو وہی سمجھ سکے گا جس نے بذاتِ خود اس کوچہ کی خاک چھانی ہوگی۔

اخترؔ صاحب مزاج دانِ غزل ہیں، تغزّل کی روح کے محرم ہیں، ان کے تئیں غزل ایک خاص انداز بیاں کا نام ہے۔ وہ صرف لب و رخسار، گُل وبلبل، قد وگیسو کی بات نہیں کرتے بلکہ زندگی کے تلخ اور ٹھوس حقائق کو بھی غزل میں سمونے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں، حسن وعشق کی باتیں ہوں، یا غم روزگار کا تذکرہ کہیں بھی غزل کی روح مجروح نہیں ہونے دیتے۔ ان کے یہاں نہ تو شبِ ہجر کا ذکر جنسی تشنگی کا نوحہ بنتا ہے، نہ زندگی کے مسائل انقلابی نعروں میں تبدیل ہوتے ہیں، ان کا اپنا ایک مخصوص اندازِ بیاں ہے جس میں تغزّل کی چاشنی غمِ روزگار کی تلخیوں کو بھی شیریں بنا دیتی ہے۔

اخترؔ صاحب کی شاعری ان کی زندگی کی ترجمان ہے۔ اخترؔ صاحب ہمیشہ ناسازگاریٔ حالات سے نبرد آزما رہے ہیں۔ اقتصادی اور معاشی نا آسودگی کے اندھیرے میں بھی فکر سخن کی شمعیں روشن کرتے رہے ہیں۔ در اصل غزل کا موضوع انسانی

نفسیات سے ہے، انسانی نفسیات کی تشکیل و تہذیب میں داخلیت سے کہیں زیادہ خارجی حالات و واقعات کا دخل ہوتا ہے۔ اس لیے غزل کے دامن میں تمام مسائل حیات کا آجانا غیر امکانی بات نہیں ہے، قد وگیسو کی باتیں ہوں یا جام وسبو کا تذکرہ، ان تمام علامتوں کے پسِ پردہ زندگی کے تلخ حقائق خود بول اٹھتے ہیں جنھیں شاعر اپنی فکر اور روح کے نہاں خانوں میں چھپائے ہوئے ہوتا ہے، قد وگیسو کی باتیں ہوں یا جام وسبو کا تذکرہ، بہار وخزاں کے مناظر ہوں یا طبعی حادثات کی منظر کشی بزم ناؤنوش کی رطب لسانیاں ہوں یا گرسنگی وتشنگی کے شکوے، ان سب باتوں کا تعلق انسان کی ذات اور اس کی نفسیات سے ہے۔ غزل انسانی نفسیات کی ترجمان ہے، اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ سازِ غزل کی وسعت جامِ جم سے بھی فزوں تر ہے، جس میں ہماری یہ بسیط کائنات ایک نقطہ کی طرح سمٹی ہوئی ہے۔ اب یہ کمال ہے صاحبِ فن کا کہ اس محال کو اپنی چابکدستی سے ممکن بنا دے۔ اخترؔ صاحب نے خلوت ناز میں بیٹھ کر غزل کی زبان میں صرف ہجر و وصال کی باتیں نہیں کی ہیں بلکہ زندگی کے کرب کو سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اخترؔ مسلمی صاحب کا پورا مجموعۂ کلام شاہد ہے کہ انھوں نے اس کا پورا احترام کیا ہے، جو محسوس کیا ہے اسے خلوص کے ساتھ لفظوں کا پیکر عطا کر دیا ہے، جو مشاہدہ کیا ہے اسے دیانت داری کے ساتھ شعر کے قالب میں ڈھال دیا ہے، حقایق کا اظہار، حالات کی سنگینی کا ادراک، حسن وعشق کی داستان، واردات و واقعات کی تشریح، عقل کے مطالبات، دل کے تقاضے، جذبات و احساسات کی ترجمانی، حسن کی عشوہ طرازیاں، عشق کی مجبوریاں، فرد کا درد، معاشرے کا کرب کیا ہے؟ اخترؔ صاحب نے

خلوت ناز میں بیٹھ کر غزل کی زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے، کبھی اپنا غم معاشرے کا غم بنانے کی کوشش کرتے ہیں، کبھی معاشرے کے غم کو اپنا غم بنا لیتے ہیں۔ اس کا ثبوت اس مجموعۂ کلام کے بے شمار اشعار میں ملے گا، اگر اچھے اشعار کی تعداد کم ہوتی تو انھیں منتخب کر کے میں بطور حوالہ ضرور پیش کرتا، دوسرے یہ کہ میں اپنی پسند کو قارئین کی رائے پر مسلّط بھی نہیں کرنا چاہتا، وہ خود فیصلہ کریں گے۔

ناطقؔ اعظمی
سرائے میر اعظم گڈھ
۹؍اپریل ۱۹۸۱ء

ماخوذ موج صبا

اخترؔ مسلمی اور ان کی شاعری

ان کے دوست کے آئینے میں

قمر اعظمی صاحب (کانپور)

آنکھوں میں دل پر خوں کی گلابیاں، اضطراب درد سے چہرہ کرن کرن جادو کی طرح بولتا، آبشار کی طرح بجتا، صبا کے دوش پر رنگ و نکہت کا قافلہ لیے کون آ رہا ہے ''اخترؔ مسلمی''، ایک سحر آگیں شخصیت، حُسن کا ادا شناس، عشق کا رازداں، غزل کا شاہزادہ، دبستان شبلیؒ اور سہیلؒ کا رخشندہ اخترؔ، سرائے میر اور اعظم گڈھ کا بانکا آڑا، ترچھا شاعر، جو برابر ۱۹۴۵ء سے ۱۹۸۱ء تک گیسوئے غزل کو سنوارتا، سجاتا اپنی دھن میں اپنے سے بے خبر، دنیا سے بے نیاز خوب سے خوب تر کی جستجو میں چلا جا رہا ہے۔

پہلا مجموعۂ کلام ''موجِ نسیم'' ۱۹۶۱ء میں چھپ کر قارئین تک آیا تھا، اور اب بیس سال بعد ۱۹۸۱ء میں دوسرا مجموعۂ کلام ''موجِ صبا'' طباعت کی منزل سے گذر کر ادب اور شعر کے قاری اور ناقد کے لیے ایک سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہے۔ پہلا مجموعۂ کلام اگر سحر رواں تھا تو دوسرا مجموعۂ کلام ایک حسین گلدستہ، جس کا ہر پھول حسن نظر اور ذوق شامہ کی لذّت کا سامان لیے ہوئے ہے۔

روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام   دہکا ہوا ہے آتشِ گُل سے چمن تمام

اخترمسلمی نے شہرت، سیاست کی ہر گرد سے بالاتر ہو کر اپنے اس دوسرے مجموعۂ کلام ''موج صبا'' پر مجھے کچھ لکھنے کا حکم دیا ہے، اس کے پیچھے ان کی محبت اور خلوص کا (جو ان کی طبیعت ہے) جذبہ ہے، میں صرف ان کے پڑھنے کے وقت کا ساتھی اور ان کا اب تک کا دوست ہوں ۱۹۵۵ء سے اب تک میرے اوپر غیر علمی، غیر ادبی سرگرمیوں کی اتنی تہ بہ تہ گرد ہے کہ میں خود اپنا چہرہ نہیں پہچان سکتا، میں نہیں جانتا کہ شعر کیا ہے؟ غزل کسے کہتے ہیں؟ ادب کیا ہوتا ہے؟ ایک ایسے شخص سے لکھنے اور اظہارِ خیال کی کوئی بات دنیا کے نزدیک بے وقت کی راگنی، اختر کے نزدیک دوستی کی معراج، میرے نزدیک اختر کا بڑکپن اور ان کے بڑے فنکار ہونے کی روشن دلیل ہے۔

اخترمسلمی غزل کے شاعر ہیں، غزل کیا ہے؟ اخفاء کا فن ہے یا اظہار کا اصل ''جذبہ'' اور مواد ہیں، یا اس کی مزماریت اور موسیقیت؟ غزل کا لہجہ خصوصی ہے یا عامی یہ صرف بیان واقعہ ہے یا رموز و علائم کی مخصوص زبان میں اشاراتی گفتگو؟ یہ صرف الفاظ کی ترتیب کے ذریعہ خیال کا اظہار ہے یا ایک نفسی آئینہ جس میں نہ صرف شاعر کا ''شعور''، ''لاشعور'' بلکہ عصری آگہی کا عکس بھی جھلکتا ہے؟ یہ صرف واردات حسن وعشق ہے یا انکشافِ ذات اور فرد و کائنات کے درمیان نئے رشتوں کی تلاش؟ میں نہ ادیب نہ ناقد اس پر گفتگو کروں بھی تو بے محل، اختر شاعر ہیں تو کتنے بڑے شاعر ہیں، ان کی شاعری صف اوّل کی شاعری ہے یا وقت کی چلتی ہوئی پروائی؟ مجموعۂ کلام سامنے ہے وقت کا قاری، مستقبل کا ناقد خود فیصلہ کرے گا، میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اختر شاعر

ہیں اور میرے دوست، اعظم گڈھ، سرائے میر کی جب بھی ادبی تاریخ لکھی جائے گی تو شبلیؒ اور سہیلؒ کا جو سلسلہ ہے اس سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی اختر ہوں گے۔

تیس سال سے برابر ہندوستان بالخصوص مشرقی یوپی اعظم گڈھ، جون پور (شیرازِ ہند) کے مشاعروں کی جان، دلوں کی دھڑکن، اخترمسلمی کو کون بھول سکتا ہے۔

اخترمسلمی اپنے پہلے مجموعۂ کلام ''موج نسیم'' کے آئینہ میں ایک ایسے شاعر اور فنکار بن کر آئے ہیں جو ماضی کی تمام صالح روایتوں کو اپنے کاندھے پر اٹھائے ہے لیکن اپنے لہجے اور اسلوب کی انفرادیت سے الگ تھلگ بھی کھڑا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد انسانی ذہن جن تلخیوں سے گذرا ہے اختر کے یہاں اس کے متعلق بھی غزل کے خاص لہجے میں اشارے ملتے ہیں، لیکن بنیادی طور سے وہ دل اور معاملات دل کی زیادہ باتیں کرتے ہیں، لیکن پورے مجموعۂ کلام کے مطالعہ کے بعد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ کہیں ان کا فن، ان کا قلم ان حدوں کو نہیں چھوتا جہاں سے غزل کی فاسقانہ روایتیں شروع ہوتی ہیں۔ یہ اس ''فیضان تجلّی'' کا ادنیٰ کرشمہ ہے جو اس خطّۂ اعظم گڈھ پر رہا ہے، نام نہاد ترقی پسندی کے بعد ماضی قریب میں ایک نئے طرز احساس کی بدولت اردو شاعری خاص طور سے غزل ایک نئے رنگ و آہنگ سے آشنا ہوئی، پرانی قدروں اور روایتوں کا منظر نامہ بدلنے لگا، نئی علامتیں، نئے استعارے ابھرے اور یہ سچ ہے کہ ''ادب'' اور ''حلقہ ادب'' نے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا مگر اسے کیا کہیے کہ دیکھتے ہی دیکھتے ''لفظیات'' کی بازی گری سے ایک ایسی ''غزل'' سامنے آئی جو اتارا ہوا لباس لگتی ہے، بے جان، بے کیف۔

اخترمسلمی کا یہ دوسرا مجموعۂ کلام ''موجِ صبا'' پتہ دیتا ہے کہ اختر کے یہاں

بھی تبدیلیاں آئی ہیں، لیکن اخترؔ نے اپنے لہجہ اور اسلوب کو اپنی فکر سے علیحدہ رکھنے کے بجائے اس کے صحیح امتزاج پر نظر گاڑ کے رکھی ہے اور اپنے فن کے شیر خالص میں فکر کی شکر کو اس طرح گھولا ہے کہ نہیں کہا جاسکتا کہ کہاں فن کا پیمانہ ہے اور کہاں فکر کی صہبا، صرف ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

وقت کی معیت میں پتّھروں کا لشکر ہے   کون ایسی آفت میں آئینہ بنائے گا

فکر و فن کی بات چلی ہے تو یہ تذکرہ نا مناسب نہ ہوگا کہ ادھر ماضی قریب میں اخترؔ کا فن کہیں کہیں ''اعجاز'' کی سرحد میں داخل ہوگیا ہے، جب وہ غزل کی غزل روایت کے پورے احترام والتزام کے بعد بھی نثر بلیغ میں کہتے جاتے ہیں۔

دوسری مقدّس تبدیلی جو ان کے چہرے سے لے کر شعروں کی قامت تک ہے جسے آپ اخترؔ کے نا آسودہ حالات کی دین کہیں یا عمر کا تقاضا، لیکن میں تو اسے اس ''خرابہ'' (مدرسۃ الاصلاح) سرائے میر اعظم گڈھ کی دین کہوں گا جہاں اخترؔ نے مسلسل کئی برس خاک اُڑائی ہے، جہاں انسان کو چاہے کچھ نہ ملتا ہو لیکن وہ ضرور ملتا ہے جو اس دنیا کے صالح ادب کے محرک اعظم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، یعنی قرآن مجید جسے پا کر اور سن کر لبید جیسے بڑے شاعر نے شعر گوئی ترک کردی تھی، اخترؔ فرماتے ہیں۔

مصلحت کیا ہے مصائب میں مشیت جانے
بندگی کا تو تقاضا ہے کہ رحمت جانے

اور شاید اسی شدید احساس نے ان کو اپنے اس مجموعۂ کلام میں حمد و مناجات شامل کرنے پر مجبور کردیا ہے۔

بات ختم کرتے کرتے اخترؔ کا ایک مصرعہ برابر دستک دے رہا ہے۔

ع   پردۂ تبسّم میں تلخیاں دبی رکھنا

پڑھ کر ایک سوال، مگر کس سے پوچھوں؟ اخترؔ جو اوائل عمر سے مسلسل غیر منقطع ادب فن اور صالح قدروں کی خدمت کرتے چلے جارہے ہیں، دنیا نے اس کے سوا (مشاعروں کی واہ واہ چھوڑ کر) انھیں اور کیا دیا ہے، کہنے دیجیے، جراحتوں کے چمن، زخموں کے چراغ، کرب، بھوک، افلاس، آگے غالب کی بات۔

ع   دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

قمرؔ اعظمی
یکم اپریل ۱۹۸۱ء

ماخوذ موج صبا

اختر مسلمی، میری نظر میں

راشد اعظمی صاحب، سرائے میر، اعظم گڈھ

اگر کلام میں صدق کا جوہر اساسی اہمیت کا حامل ہے تو یقیناً دنیائے ادب میں اختر مسلمی کے کلام کا ایک مخصوص مقام ہے، اس لیے ان کے احساس وشعور اور فکر وعمل میں وہ یکسانیت پائی جاتی ہے جو سچائی کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ اس لیے کہی جاسکتی ہے کہ ان کا ابتدائی کلام ایک ایسی زندگی کا عکاس ہے جو صہبائے شباب کے نشہ سے مدہوش ہو، ایسی مدہوشی جس میں پھول اور پتھر دوست اور دشمن، راحت اور تکلیف، صواب و ناصواب میں تمیز نہیں ہوا کرتی، وہ سرمستی شباب ہی تھی جو انھیں افسانۂ انجمن بناتی رہی اور وہ گرد وپیش سے بے پروا اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھاتے رہے، اس دور میں غیروں نے ان پر پھبتیاں بھی کسیں اور اپنوں نے مخلصانہ مشورے بھی دیے لیکن انھوں نے اپنی واردات و کیفیات کے اظہار میں کبھی بھی الفاظ کی بازی گری سے پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی، صرف اس لیے کہ ان کی فطرت سچائی کی دلدادہ تھی۔

اختر صاحب جب عمر کے اس مرحلہ میں پہنچے جہاں جوئے حیات عہد شباب

کے نشیب وفراز سے گزر کر تلاش وجستجو کی وادی میں داخل ہوتی ہے تو ہمیں ان کے کلام میں غور وفکر کا ٹھہراؤ اور تلاش وجستجو کی تگ و دَو نظر آتی ہے، لیکن ان کے ذوقِ طلب اور فکر رسا نے بہت جلد تذبذب اور تامل کی اس سنگلاخ وادی سے نکال کر وہاں پہنچادیا جہاں انھیں زندگی کی وہ صراطِ مستقیم نظر آئی جسے ان کی فطرت سلیم ڈھونڈ رہی تھی، یہی وہ مقام ہے جہاں سے اختر مسلمی نے اپنا اور اپنے گرد وپیش کا ازسرِ نو جائزہ لیا ہے اور ان کی شاعری زندگی کے رنگارنگ پہلوؤں کی ترجمان بنتی ہے۔

اختر صاحب کی شاعری بنیادی طور پر عشق ومحبت کی واردات و کیفیات کی ترجمان ہے۔ وہ اپنے آئینۂ کلام میں کہیں زلف مجاز کے زیر سایہ آنکھ مچولی کرتے دکھائی دیتے ہیں تو کہیں نور حقیقت کی جلوہ سامانیوں سے حیران وششدر نظر آتے ہیں، لیکن ان کے ذوقِ طلب کی اس اختلافی کیفیت کے پیچھے تلوّن مزاجی کی کارفرمائی نہیں ہے بلکہ فی الواقعہ یہ ان کی طلب وجستجو کا تدریجی سفر ہے۔

میرے لیے تو سہل تر ہوگئی حق کی معرفت
زینۂ معرفت بنا عشق صنم کا سلسلہ
(اختر مسلمی)

وہ محبت ہی کا فقدان ہے جس نے چمن زارِ انسانیت کو آتش کدہ بنا رکھا ہے۔ محبت جب انسانی فکر وعمل میں روح بن کر سرایت کرتی ہے تو دنیائے انسانیت میں نسیم امن کے سکوں بخش جھونکے چلتے ہیں اور لطف وعنایت کے حسین گلاب کھلتے ہیں۔ موج نسیم ہو، یا نکہت گل، داد وصلہ سے بے پروا اپنے ماحول پر مسلسل محبت پاشیاں کررہے ہیں، مکتب فطرت کی یہی تعلیم اختر صاحب نے اپنی دنیا کو دی ہے۔

محبت منزلِ انسانیت ہے
محبت کی کوئی منزل نہیں ہے

محبت کا دامنِ لطف کا کل درخسار اور گُل و بلبل ہی کی دنیا تک محدود نہیں ہے، ماں کی ممتا، باپ کی شفقت، استاد کی دلسوزی اور رہنما کی جانکاہی محبت کے شجر سایہ دار ہی کی مختلف شاخوں کے سائے ہیں جس میں کشت انسانیت اپنے برگ و بار لاتی ہے۔ اسی لیے ہر وہ زندگی جو محبت کے محور پر گھومتی ہے اپنے ہر روپ میں لطف و کرم کا ابر گہر بار دکھائی دیتی ہے۔

معاشرے کا ہر فرد اپنے دائرۂ عمل میں گوناگوں فرائض کا حامل ہوتا ہے اور ان فرائض کی ادائیگی کے لیے انسانی فطرت اسے مہمیز کرتی رہتی ہے، شاعر بھی معاشرے کا ایک فرد ہوتا ہے اور سماج کے ایک رکن کی حیثیت سے وہ بھی اپنے فرائض کو محسوس کرتا ہے، شاعر کا یہی احساس اس کے فکر و شعور کی روح بن کر اشعار کے پیکر میں ظاہر ہوتا ہے۔

اخترؔ صاحب کے فکر و نظر کے سوتے چوں کہ محبت کے چشمے سے پھوٹے ہیں ان کے احساس پر اس کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ ان کی ذات خود محبت کا مجسم پیکر اور ان کی شاعری محبت کا مرقع زرنگار بن گئی ہے، ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خوشی ہی شرط نہیں لطفِ زندگی کے لیے   متاعِ غم بھی ضروری ہے آدمی کے لیے

☆

لطف ہی کیا حیات کا گر نہ ہو غم کا سلسلہ   ختم نہ ہو خدا کرے رنج و الم کا سلسلہ

☆

ہائے اس رہروِ برباد کی منزل اے دوست   جس نے گھبرا کے ترا نقشِ قدم چھوڑ دیا

زمانہ تیرے لیے بے قرار ہو جائے   تو دوسروں کے لیے بے قرار ہو تو سہی

☆

راس آئے تو کرم ہے نہ راس آئے تو ستم   کہتے ہیں جس کو عشق جزا بھی سزا بھی ہے

☆

جب ہر اک شمع تمناؤں کی بجھ جائے گی   تب کہیں جا کے شبِ غم کا سویرا ہوگا

☆

اخترؔ زباں سے بھی نہ کرو اس سے عرض حال   چہرے سے جو سمجھ نہ سکے دل کی کیفیات

☆

ہیں ترے دل کی طرح داغ مرے دامن پر   دل مگر صاف ہے ناصح ترے دامن کی طرح

☆

چونکے جو ہم تو جائزۂ دو جہاں لیا   غافل ہوئے تو اپنی خبر کو ترس گئے

☆

انساں کے دل کا حال بھی کتنا عجیب ہے   مانے تو ایک بات نہ مانے تو لاکھ بات

☆

اک بار ان کو پانے کی دل میں تھی آرزو   سو بار اپنے آپ کو کھونا پڑا مجھے

☆

برباد ہوگیا ہوں مگر مطمئن ہے دل   شرمندۂ کرم تو نہ ہونا پڑا مجھے

☆

ہے اس کے در کی بات الگ ورنہ دوستو   لاکھ آستاں ہیں جو مرے سر کو ترس گئے

☆

چہرے کی ہر شکن میں ہے تحریر شرحِ غم — کیا پوچھتے ہو حال مرا دیکھتے نہیں

☆

کچھ اس طرح سے مٹا میرے دل سے غیر کا نقش — کہ اب تو غیر بھی اپنا دکھائی دیتا ہے

☆

نشانِ راہ اندھیروں میں گُم نہ ہوجائے — بڑھے چلو ابھی رستہ دکھائی دیتا ہے

☆

مصلحت کیا ہے مصائب میں مشیّت جانے — بندگی کا تو تقاضا ہے کہ رحمت جانے

☆

برس پڑیں گی گھٹائیں امنڈ کے رحمت کی — تو سر جھکا کے ذرا اشکبار ہو تو سہی

☆

یہ اور اسی طرح کے بہت سے اشعار اخترؔ مسلمی کی عفت نظر اور پاکیزگی خیال کے آئینہ دار ہیں، خیال وفکر کی ان رفعتوں تک اختر صاحب کوچۂ مجاز سے گزر کر پہنچے ہیں، اس لیے اگر ان کے دامانِ شاعری پر کہیں کہیں اس کوچے کی گرد دکھائی دیتی ہے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے، اس لیے کہ جو ہر لطیف اپنی جلوہ نمائی کے لیے کسی نہ کسی پردۂ کثیف کا مرہونِ منت ہوا کرتا ہے۔

بقول غالبؔ

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

راشدؔ اعظمی، سرائے میر اعظم گڈھ

۲۱/مارچ ۱۹۸۱ء

ماخوذ موج نسیم

پیش لفظ

مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی
مدیر معارف و ناظم دارالمصنفین اعظم گڈھ

نئی نسل میں شاعروں کی بڑی بہتات ہے مگر ان میں بہت کم ایسے ہیں جو شعر گوئی کا صحیح ذوق اور سلیقہ رکھتے ہیں، اُن مستثنیات میں ایک اخترؔ مسلمی صاحب بھی ہیں۔ ان کا کلام ان کی زبان سے بھی سننے کا اتفاق ہوا ہے اور ان کی متفرق غزلیں بھی نظر سے گزریں، اس سے اندازہ ہوا کہ وہ تغزل کے مزاج شناس ہیں، اور اس کا ستھرا مذاق رکھتے ہیں، ان کے کلام میں تخیل کی پاکیزگی و لطافت زبان و بیان کی صحت و سلاست اور تغزل کی تمام ظاہری ومعنوی خوبیاں موجود ہیں۔

اگر ان کی مشق جاری رہی تو آگے چل کر وہ نوجوان شعراء میں ایک ممتاز مقام حاصل کریں گے۔

معین الدّین احمد

۴/دسمبر ۱۹۶۱ء

ماخوذ موجِ نسیم

اظہارِ خیال

فخرِ مشرق علاّمہ شفیق صاحب جونپوری

اخترؔ مسلمی صاحب سے مجھے ہمیشہ یہ توقع تھی کہ وہ مستقبل میں ایک ممتاز شاعر کی حیثیت سے متعارف ہوں گے، بحمد اللہ وہ وقت آ گیا، موصوف اپنا مجموعۂ کلام شائع فرما رہے ہیں، جس سے ہماری توقع پوری ہو رہی ہے، اور ارباب ذوق ان کی خوش گوئی کے معترف ہوں گے۔

اخترؔ مسلمی صاحب کے کلام میں کشش ہے جو خود ہی ناظرین کو ان کی طرف متوجہ کرلے گی، اخترؔ صاحب اپنے حلقہ میں بڑی حد تک رونما ہو چکے ہیں، لیکن ابھی ان کو ان کا پورا حق نہیں ملا ہے، یہ مجموعہ بتا دے گا کہ موصوف کس قدردانی کے مستحق ہیں۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

شفیق جونپوری غفرلہ الوی

۱۹/نومبر ۱۹۶۱ء مطابق ۱۰/جمادی الثانی ۱۳۸۱ھ

ماخوذ موجِ نسیم

مقدّمہ

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد صاحب

میں غزل کو نہ صرف ایک روایت بلکہ ایک تہذیب اور ایک معاشرت کا تسلسل سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اُس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی ایمائیت ہے، دراصل وہی شعر تغزل کی جان ہوتا ہے جس میں یہ ایمائی قوت اس انداز سے سمودی گئی ہو کہ وہ ہمارے وجدان کے ساتھ ساتھ ہمارے دماغ کو بھی متاثر کر سکے۔ غزل گو شاعر خارجی حالات سے بے نیاز تو نہیں رہ سکتا مگر وہ غزل کے رموز و علائم سے کام لے کر اپنے محسوسات کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اُس کے اشعار کے زیر و بم میں نبض کائنات کی دھڑکنیں سُنائی دینے لگتی ہیں بادہ و ساغر کے پردے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو کرنا اور آرائش خم کاکل میں اندیشہ ہائے دور و دراز کا احساس دلانا ہمیشہ سے اچھے شعراء کا طرۂ امتیاز رہا ہے اور انھوں نے اپنے عہد کی حقیقتوں کو اشعار کے پیمانے میں اس طرح ڈھالا ہے کہ وہ ہر دور کی حقیقتیں بن گئی ہیں۔ رشید احمد صدیقی کا یہ ادعا اپنی جگہ پر بالکل درست ہے کہ غزل کی فضا اس قدر مقطر ہو چکی ہے کہ اس میں مزید کشید کی گنجائش باقی نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود ذہین اور باشعور شاعر روایتی اور

مقبول عام کُلّیوں پر قائم رہتے ہوئے بھی جدید میلانات سے ہم آہنگ نظر آتا ہے اور غزل کے امکانات کو حتی المقدور وسیع تر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اختر مسلمی کو میں اعظم گڑھ کے غزل گو شعراء کی اسی صف میں شامل کرتا ہوں جو قدیم بنیادوں پر قائم رہتے ہوئے بھی جدید میلانات کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں اور تغزل کے پیمانے میں وارداتِ قلب کے ساتھ ساتھ روحِ عصر کو بھی عریاں کرتے ہیں۔

اعظم گڑھ کے شعراء کی اس پرانی نسل کا خاتمہ جس کی شاعری بصائر و تاملات کی شاعری رہی ہے، علّامہ اقبال سہیل اور مرزا احسان احمد بیگ پر ہوتا ہے لیکن اُن لوگوں کے بعد بھی یہاں کی ادبی فضا میں زندگی اور توانائی کے آثار پائے جاتے ہیں، اور کچھ ایسی شخصیتیں ابھرتی ہیں جن کے اندر فکر وفن کے وہ تمام عناصر پائے جاتے ہیں جو کسی فن کار کی ابدیت کے ضامن بن سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں اختر مسلمی کا نام کافی نمایاں ہے۔ اُن کی غزلیں اپنے تغزّل وترنم، اپنی والہانہ ربودگی اور اپنے غنائی آہنگ کی بناء پر ہمارے لیے باعثِ فخر ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام میں اگر ایک طرف گیسوئے دوست کو سنوارا ہے اور حُسن کی تزئین کے فرائض انجام دیے ہیں تو دوسری طرف انھوں نے خارجی محرکات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اور حالاتِ حاضرہ اور زندگی کے دوسرے مسائل سے چشم پوشی نہیں کی ہے۔ اُن کی غزلوں میں تازگی وتوانائی، تاثیر وشعریت کے ساتھ ساتھ حوادثاتِ زمانہ کے ہلکے ہلکے انعکاسات بھی نظر آتے ہیں اور وہ کلاسیکی روایات کی روشنی میں آج کی زندگی کی طرف اپنا ہمہ گیر نقطۂ نظر منضبط کرتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر وارداتِ قلب اور معاملاتِ عشق کے شاعر ہیں، شاعری اُن کے نزدیک دل کا معاملہ ہے، حسن وعشق ناز ونیاز، ہجر و وصال، شوق و انتظار اُن کے محبوب موضوعات ہیں۔ لیکن اُن کو وہ اتنے لطیف اور کیف پرور

انداز میں بیان کرتے ہیں کہ حسن وعشق کی ہم آہنگی میں زندگی کے جو سہارے اور تعمیری پہلو مضمر ہیں، وہ واضح ہو جاتے ہیں، اور اُن کا کلام سماجی خیر وبرکت کا ایک نیک شگون بن جاتا ہے۔ اُن کی غزلوں میں تجربے کی صداقت اور ہنرمندانہ سادگی کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ ان کا دل ایک چوٹ کھایا ہوا دل ہے کسی کی نگہِ مختصر کا سہارا پاکر وہ شاعر بنے ہیں اور یہی تجربہ ان کی داخلی زندگی میں جذب ہوکر عشقیہ جذبات کا ایک بڑا لطیف مرکب بن گیا ہے، اسی لیے میرا یہ اعتماد ہے کہ جب تک عاشقانہ جذبات انسان کی رگ وپے میں موجود ہیں اور ان کا اظہارِ تہذیب وشائستگی کے دائرے میں قابلِ قبول ہے اس وقت تک اختر مسلمی کی غزلیں نہ صرف زندہ رہیں گی بلکہ پسند کی جائیں گی۔

چند اشعار ملاحظہ ہو:

ان کی زلفیں ہی نہ سلجھیں اور ہم   داستانِ زندگی دہرا گئے

☆

ہجومِ غم میں نکل آئی ہے جو آہ کبھی   تو کی ہے بے اثری کی بھی پھر دعا میں نے
جلا کے دل میں تری شمعِ آرزوئے دوست   ہر اک چراغِ تمنّا بجھا دیا میں نے

☆

روشنی ہونے لگی دل کے قریب   شاید آ پہنچے ہیں منزل کے قریب
کچھ نہ تھا منظور جز ذوقِ طلب   لوٹ آئے جا کے منزل کے قریب

☆

احساس دل کو ہوتا ہے اک انس خاص کا   ملتے ہیں لوگ جب کبھی اُن کے دیار کے

☆

تصویرِ وفا بن کے مرا نقش ہے دل میں   یوں لب پہ کسی کے مرا نام آئے نہ آئے

اختر اگر آباد رہے گُل کدۂ دل — پھراس میں تو کچھ مست خرام آتے رہیں گے

☆

سکوں ملے گا بھلا بوئے زلفِ یار سے کیا — ابھی یہیں سے وہ خود بے قرار گذری ہے

☆☆☆

ہائے رے اُن کی نگاہِ خشمگیں — آرزوؤں کو پسینہ آ گیا

☆

کسی پہ گل کی بارشیں کسی کو خار وخس ملے — یہ باغباں کا ظرف ہے چمن چمن کی بات ہے

کسی کو خم کی خم ملی کوئی ترس کے رہ گیا — ہٹاؤ جانے دو تمھاری انجمن کی بات ہے

جو بوالہوس ہیں اُن کو تم وفا پرست کہتے ہو — چلو یہی سہی تمھارے حسنِ ظن کی بات ہے

☆

اختر اب آپ کر چکے دیر و حرم میں جستجو — منزلِ عشق کا نشاں دار و رسن سے پوچھیے

☆

مجھے بے انتہا مسرّت ہے کہ اُن کا مجموعۂ کلام شائع ہو رہا ہے اُن کے اندر وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو کسی شاعر کو ابدیت بخش دیتی ہیں، ایک چوٹ کھایا ہوا دل، دل کے اندر نیکی وشرافت کے جوہر اور وہ تہذیب اور کلچر بھی اُن کے یہاں پایا جاتا ہے، جن سے عشقیہ شاعری کی آبیاری ہوتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اُٹھائیں گے اور اپنے ادبی وشعری مشاغل کو سنجیدگی کے ساتھ جاری رکھیں گے۔

ملک زادہ منظور احمد

۱۹۶۱/۱۲/۴

ماخوذ موجِ نسیم

اظہارِ حقیقت

حضرت عارف عبّاسی صاحب تلمیذ حضرت جگر مرحوم

دس برس کا زمانہ گزرا جب میں حضرت علامہ سہیل مرحوم کے دولت کدہ پر نذرانۂ اخلاص وعقیدت پیش کرنے کے لیے پہلی بار حاضر ہوا تو میری ملاقات ایک جواں سال اور خوش گو شاعر سے ہوئی۔ ابتدائے عمر ہی میں کلام کے آہنگ اور کشش نے مجھے بے ساختہ اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

''وہ جواں سال و جواں فکر شاعر اختر مسلمی تھے''

بار بار کی ملاقات نے میری اس خوش فہمی کو یقین میں تبدیل کر دیا کہ شاعر کی اگر صحیح تربیت ہوئی اور مشقِ سخن جاری رہی تو خاکِ اعظم گڈھ کی مردم خیزی میں ایک ایسے خوش فکر شاعر کا اضافہ ہوگا جس کے کلام کا صحیح مذاق اور آہنگ اہلِ نظر سے خراجِ تحسین وصول کرے گا۔

آج جب میں نے یہ سنا کہ ان کے مجموعۂ کلام کی ترتیب و اشاعت کا کام مکمل ہو رہا ہے تو میں اس خیال سے مسرت محسوس کر رہا ہوں کہ میرا قیاس غلط نہیں تھا اور جناب اختر مسلمی اپنی جملہ صلاحیتوں کے ساتھ منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔

غزل کی فطری نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ ساتھ صرف الفاظ و مضامین کی بلندی، خارجی اور داخلی کیفیات کا صحیح اظہار ہر شاعر کے بس کی بات نہیں، مگر جناب اخترؔ مسلمی یہاں بھی اپنی انفرادیت کو نمایاں کئے ہوئے ہیں، حضرت علامہ سہیلؔ مرحوم نے خاک اعظم گڈھ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

ع

جو ذرّہ یہاں سے اُٹھتا ہے وہ نیّرِ اعظم ہوتا ہے

جناب اخترؔ مسلمی کا معیارِ فکر اس مصرعہ کے ہر حرف کی تصدیق کر رہا ہے۔

دُعا گو

عارف عبّاسی

ماخوذ موجِ نسیم

تبصرہ و تعارف

محشر اعظمی صاحب، سابق ایڈیٹر، اخبار انسان و عمل، آئینہ، ساحل، اپنی آواز

اس نئے دور میں جو ہندوستان میں ۱۹۴۷ء کے بعد آیا ہے جو نوجوان شعراء نئی امنگ اور نئے حوصلے لے کر ہمارے سامنے آئے ہیں ان کی فہرست میں اخترؔ مسلمی کا نام بہت نمایاں طور پر نظر آرہا ہے۔

اخترؔ مسلمی ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں مسلم پٹی کے رہنے والے ہیں، انھوں نے مدرسۃ الاصلاح جیسے مخزنِ علم و ادب سے فیض حاصل کیا ہے اور انھیں علامہ اقبال سہیلؔ مرحوم جیسے ماہر فن اور قادر الکلام شاعر سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ یہ ابھی نوجوان ہیں لیکن ان کی شاعری اس بات کی آئینہ دار ہے کہ کم عمری ہی میں انھوں نے زندگی کے زیادہ سے زیادہ تجربات کئے ہیں اور زبان و بیان اور خیالات کی بلندی و ہمہ گیری کے اعتبار سے اخترؔ مسلمی ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔

اخترؔ مسلمی نہ قدامت پرست ہیں نہ ترقی پسند، ان کے اپنے مذاقِ سلیم نے جہاں بھی کوئی اچھائی دیکھی اپنا لی۔ نہ اُن کے یہاں قدامت پرستوں کی کٹر روایت پرستی ہے، نہ ترقی پسندوں کا محض سیاسی پروپیگنڈا اور پھر دونوں کی خوبیاں بھی انھوں

اپنے چار سو سے بھونڈی اور بھدی حقیقتوں کو لیتا ہے اور عالم خیال میں انھیں سنوار کر تشبیہ واستعارے اور اشارے و کنائے کے جامے میں پیش کرتا ہے۔ جس سے ان حقائق میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور لوگ شعر کی محبوبی سے متأثر ہوتے ہیں۔ دیکھیے کہ مندرجہ ذیل اشعار کس طرح ہندیوں کی غلامانہ ذہنیت کو ظاہر کرتے ہیں، حالاں کہ آزاد ہوئے کچھ سال گزر گئے:

پیدا ابھی مذاقِ گلستاں نہ کر سکے　　تبدیل ذوق خوگرِ زنداں نہ کر سکے
ہونے کو تو طلوع ہوئے لاکھ آفتاب　　شامِ خزاں کو صبحِ بہاراں نہ کر سکے

شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ عشق بھی کرتا ہو لیکن عشق کے لیے محبوب کی وحدت ضروری نہیں ہے اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ محبوب صرف عاشق کا ہو کے رہ جائے۔ اردو شاعری کا ایک دور وہ بھی تھا جب عاشق یہ تمنا کرتا تھا کہ اس کا محبوب صرف اسی کا ہو اور وہ بھی صرف ایک کا ہو کے رہے۔ اس دور میں یہ ناممکن ہو گیا ہے، اب محبت کو شوہر تک محدود نہیں کیا جاسکتا:

اخترؔ اگر آباد رہے گل کدۂ دل!
پھر اس میں تو کچھ مست خرام آتے رہیں گے

اور یہ ''کچھ مستِ خرام'' راہِ سیاست کے رہزن بھی ہیں، رہنما بھی ہیں، خدا بھی ہیں، بت بھی ہیں، عوام بھی ہیں، خواص بھی ہیں۔ دور حاضر نے عشق کو اتنی وسعت عطا کی ہے کہ اسے کسی ایک کی ذات سے نہیں باندھا جاسکتا۔ ایک غزل کے چند اشعار دیکھیے۔ ہمارا شاعر اس دور کی سیاست کو کس لطیف انداز اور عشق کے پیرائے میں پیش کرتا ہے:

کسی پہ گُل کی بارشیں کسی کو خار و خس ملے　　یہ باغباں کا ظرف ہے چمن چمن کی بات ہے
کسی پہ ہیں عنایتیں کہیں ستم طرازیاں!　　بُرا ہم اس کا مانیں کیا یہ بانکپن کی بات ہے
کسی کو خم کے خم ملے کوئی ترس کے رہ گیا　　ہٹاؤ جانے دو تمہاری انجمن کی بات ہے
جو بوالہوس تھے ان کو تم وفا پرست کہتے ہو　　چلو یہی سہی تمہارے حسنِ ظن کی بات ہے
وفا کرو جفا ملے بھلا کرو بُرا ملے　　ہے ریت دیس دیس کی چلن چلن کی بات ہے
ستم بھی اخترؔ اپنوں کے جو ہوں تو بھول جائیے　　بھلی ہو یا بری سب اپنے ہی وطن کی بات ہے

یہ سیاسی محبوب ہمارے غزل گو شاعر کو پریشان کرتے ہیں، ستاتے ہیں، جیل میں بند کرتے ہیں، پھانسی پر لٹکاتے ہیں اور کبھی کبھی اس عاشق حق پرست کو مٹانے کی سازشیں بھی کرتے ہیں، کیوں کہ وہ صرف انھیں کا عاشق نہیں ہوتا بلکہ اس کے سینے میں کروڑوں عوام کی بھی محبت ہوتی ہے۔

اب توقع ہی کیا باغباں سے
سازشیں کر رہا ہے خزاں سے

پریشان ہو کے ہمارا شاعر تڑپ اٹھتا ہے اور شکوۂ بیداد بھی کبھی کبھی دبی زبان سے اور کبھی واضح طور سے کرتا ہے۔

لالہ و گُل سے پوچھیے سرو وسمن سے پوچھیے　　مری چمن نوازیاں حسن چمن سے پوچھیے
کر گئیں سرخرو اسے کس کے لہو کی سُرخیاں　　یاد نہ ہو جو آپ کو خاکِ وطن سے پوچھیے
میری نوائے حریت سے ہیں تمام آشنا　　کوہ و دمن سے پوچھیے گنگ وجمن سے پوچھیے
اخترؔ اب آپ کر چکے دیر و حرم کی جستجو!　　منزلِ عشق کا نشاں دار و رسن سے پوچھیے

مقطع پر خاص طور سے غور کیجیے شاعر کو مذہبی سیاست سے کچھ نہ ملا اس لیے اس کا

نہ دیکھو یوں محبت کی نظر سے
یہ امرِت ہی مجھے سم ہو نہ جائے

زمانہ کے تلوّن کو تو سمجھو
مسرّت ہی کہیں غم ہو نہ جائے

ہے تعمیرِ حیات اختر اسی سے
یہ دردِ دل کہیں کم ہو نہ جائے

☆☆

☆

نہاں ہے خوئے صیّادی ہمارے باغبانوں میں
عنادل[1] باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

بس اک احساس آزادی سے دل ہے مطمئن ورنہ
قفس کا رنگ پیدا ہوگیا ہے آشیانوں میں

خبر کیا تھی بہارِ گُلستاں یہ دن بھی آئے گا
ستائے گی قفس کی یاد ہم کو آشیانوں میں

---

[1] مصرعہ طرح

ہوگا وہ کوئی جس پہ ہیں ان کی نوازشیں
ہم تو اِک التفاتِ نظر کو ترس گئے

ہے اُس کے در کی بات الگ ورنہ دوستو
لاکھ آستاں ہیں جو مرے سر کو ترس گئے

چونکے جو ہم تو جائزۂ دو جہاں لیا
غافل ہوئے تو اپنی خبر کو ترس گئے

اختر سجی ہے گوہرِ فن سے مری غزل
کہنا نہ اب کہ اہلِ ہُنر کو ترس گئے

☆☆

اصلاحی ترانہ

۲۹/ دسمبر ۱۹۶۹ء کو مادرِ علمی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے مندوبین کی آمد کے موقع پر جناب اشتیاق احمد صاحب راشد کی فرمائش پر یہ ترانہ لکھا گیا اور پڑھا گیا۔ اختر مسلمی

☆

یہ ہمارا چمن ہے ہمارا چمن
رحمتِ ایزدی اس پہ سایہ فگن — نورِ شمعِ یقیں زینتِ انجمن
بوئے ایماں ہے پھیلی چمن در چمن — جوئے عرفاں ہے آغوش میں موجزن
یہ ہمارا چمن ہے ہمارا چمن
گود میں اس کی پلتے ہیں علم و ہنر — ہر طرف ضوفشاں اس کے شمس و قمر
اس کی مٹّی سے اُگتے ہیں لعل و گُہر — اس کے ذرّے ہیں صد رشکِ دُرِّ عدن
یہ ہمارا چمن ہے ہمارا چمن
خدمتِ خلق ہی اس کی تقدیر ہے — اس کے پیشِ نظر دیں کی تشہیر ہے
اور علومِ جدیدہ کی تطہیر ہے — اس کا مقصد ہے تجدیدِ علمِ کہن
یہ ہمارا چمن ہے ہمارا چمن
اپنے سینوں میں رکھتے ہیں ہم ولولے — ہم سے سیکھیں چلن مشرقی منچلے
درسِ تہذیب لیں مغربی حوصلے — ہر روش اس کی گہوارۂ علم و فن
یہ ہمارا چمن ہے ہمارا چمن



پیدائش یکم جنوری ۱۹۲۸ء

وفات ۲۵/اپریل ۱۹۸۹ء

جناب اختؔر مسلمی صاحب واقعی مستند شاعر ہیں۔

اُن کا شمار ملک کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔

نذیر بنارسی

WISE PUBLICATIONS
10-Azmi Apartments, N-1, Abul Fazl Enclave
Jamia Nagar, New Delhi-25

ISBN 81910753-9-3
9788191075397